مدارس عربیہ کا نصاب تعلیم

علمی اور مطالعاتی زندگی کے بارہ میں سوالنامہ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہٗ کی خدمت میں بھی بھیجا گیا تھا۔ پیش نظر مضمون جو کچھ عرصہ قبل لکھا گیا ہے میں اس سوالنامہ کی ایک شق پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے ہم اسے یہاں شائع کر رہے ہیں۔ "ادارہ"

عرصۂ دراز سے دینی حلقوں میں مسئلہ نصاب تعلیم زیر بحث ہے اور شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ موجودہ مدارس دینیہ عربیہ کا مروجہ نصاب قابل ترمیم ہے اور مسائل حاضرہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ نصاب کافی نہیں، امت کے مصالح اور وقت کے تقاضے اس سے پورے نہیں ہو سکتے۔ بلکہ بہت سے ابنائے عصر اور جدید تعلیم یافتہ قدیم نصاب کی افادیت ہی سے منکر ہیں۔ یہاں تک کہ بعض غیر سنجیدہ دماغ تو ان علمی درس گاہوں کے وجود کو بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

جہاں تک اصل موضوع بحث کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ وقت کی دوسری اہم ضرورتوں کی طرح یہ مسئلہ بھی اہم اور بے حد توجہ کا مستحق ہے۔ زمانہ بدل گیا، خیالات بدل گئے، قوموں کی نفسیات بھی تبدیل ہو گئیں، سائنس کی ترقیات نے معاشیات و اقتصادیات کی نئی راہیں کھول دیں فقہ اسلامی کے ابواب میں تمدن حاضر کے بہت سے جدید ابواب کا اضافہ ہوا، ممالک خارجہ سے تجارت درآمد کے نئے وسائل اور بینکوں کے نظام نے اسلامی نقطۂ نگاہ یا شرعی نظام کے راستے میں بہت سے پیچیدہ مسائل پیدا کر دئے، نئے افکار و خیالات جدید معتقدات اور مختلف علمی و دینی فتنوں نے

جدید علم کلام کی اہمیت اور واضح کردی۔ یہ خیالات سب درست اور بجا ہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حق تعالیٰ جل ذکرہ نے بھی باوجود اپنی قدرت لامحدود اور علم محیط کے انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات میں وقت کے تقاضوں کی رعایت فرمائی۔ عہد ابراہیمی میں صابئین بابل و نینوی کے طبیعین کا عروج تھا، اس لئے ابراہیم علیہ السلام کو معجزہ بھی ایسا ہی عطا ہوا کہ صابئین اور طبیعین کے لئے باعث حیرت و اعجاز ہو۔ موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں سحر و شعبدہ بازی اور اس قسم کے فنون کا عام چرچا تھا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یونانی اطبّا اور ان کے حیرت انگیز معالجات کا دور دورہ تھا۔ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اگر سرزمین عرب میں فصاحت و بلاغت، قوت بیانی، شعر و خطابت کا شہرہ تھا۔ تو ایران میں خسروانہ کروفر و ایرانی تہذیب کا دل رُبا منظر تھا، اور روم الکبریٰ میں بازنطینی نظام و آئین کارفرما تھا، لیکن دنیا نے دیکھا اور بڑی حیرت سے دیکھا کہ ان طاغوتی طاقتوں کو رب العلمین کے بندوں کی معجزانہ کارفرمائیوں نے کیسی فاش شکست دے دی اور رب العلمین نے کیسے فصیح و بلیغ معجزانہ اسلوب و بیان میں کیسا محیر العقول دستور اور مکارم اخلاق کا کیسا جامع ترین نظام نامۂ حیات نازل فرمایا۔

اور پھر اسلام کی علمی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ ہمارے صالحین نے ہر دور میں وقت کے تقاضوں اور امت کی مصلحتوں کا کیسے خیال کیا۔ بلاشبہ اب بھی اسکی تعقید کرنے کی ضرورت ہے اور صحیح ضرورت ہے۔ عصری علوم کی ضرورت اور معاشی و اقتصادی و سیاسی مشکلات کی عقدہ کشائی کے سوال کی اہمیت بھی واضح ہے۔ لیکن تعلیم قرآن، درس حدیث اور علوم عربیہ وغیرہ قدیم علوم و معارف کی جتنی اہمیت اب ہونی چاہئے شاید ہی کسی دور میں اہمیت سمجھی گئی ہو۔ کسی مفید اور نافع علاج کی اہمیت اسی وقت زیادہ محسوس ہونی چاہئے جبکہ مرض عام ہو اور ضرورت شدید ہو۔ ہماری انہی دینی درسگاہوں سے اسی صدی میں ایسے ایسے اکابر اور امت کے ایسے ایسے رہنما پیدا ہوئے کہ تاریخ بجا طور پر ان پر فخر کرے گی۔ اور دنیائے اسلام کی علمی تاریخ میں ان حضرات کے اسماء گرامی بہت جلی حروف میں لکھے جائیں گے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ | قدیم نصاب پر ایک بہت بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ حضرات سارے علوم عربیہ پڑھ لینے کے بعد عربی گفتگو پر قادر نہیں ہوتے، کتنے علماء کے اسماء گرامی پیش کئے جا سکتے ہیں جو بلا تکلف فصیح ترین عربی لب و لہجہ میں گفتگو کی مقدرت رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بولنا خاص ممارست و تمرین و مشق پر موقوف ہے۔ ہم نے ممالک اسلامیہ بلکہ خاص قاہرہ و مصر کے بہت سے علماء کو دیکھا کہ وہ فصیح و صحیح عربی پر اتنا لا یوری قدرت نہیں رکھتے، بلکہ بعض بہترین لکھنے والے ادباء

کو دیکھا کہ وہ بلا تکلف فصیح علمی زبان بولنے پر قادر نہیں جیسے وہ لکھتے ہیں بلکہ عام مروجہ عامیانہ زبان استعمال کرتے ہیں۔

تیسری چیز یہ کہ عربی علوم کو لسانیات کے طرزِ تعلیم پر نہیں پڑھایا جاتا بلکہ کتابیں علوم سکھانے کے لئے پڑھائی جاتی ہیں۔ اسی لئے ہمارے عربی نصاب کے ابتدائی درجات میں متعدد کتابیں صرف و نحو کی فارسی میں پڑھائی جاتی ہیں۔ الغرض یہ کہ علوم کو درجۂ اولیٰ میں رکھا گیا ہے۔ اور لسانیات کو ثانوی درجہ بلکہ ضمنی درجہ دیا گیا۔ اس لئے جو عربی بولنے لکھنے کو مقاصد میں شمار نہیں کیا گیا تھا۔ بہرحال یہ ایک نقطۂ نگاہ کا فرق تھا۔ انگریزی تعلیم میں زبان کو پہلے درجہ پر رکھا گیا اور جو اسلوب تعلیم زبان کے لئے مناسب ہو سکتا تھا۔ وہی اختیار کیا گیا اور پھر دنیا میں جو تیز غلبی مسائل اس کے لئے تھے وہ اس پر مستزاد ہے بے شک اب وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر اس اسلوب کو بدلنے اور عربی زبان کی تعلیم مقاصد میں شامل کر کے پہلے درجہ پر رکھنے کی ضرورت ہے۔

قدیم مروجہ نصاب پر ناقدانہ نظر اور اس کی خصوصیات

اس سے پہلے کہ ان وجوہ تنقید کا ذکر کیا جائے جو مروجہ نصاب مدارسِ عربیہ پر ہو سکتے ہیں، یہ گذارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اصل قصور نصاب کا نہیں بلکہ اسلوب تعلیم و منہاج تدریس کا ہے۔ نصاب کیسا بھی ہو اگر طرزِ تعلیم و طریقۂ تربیت کی اصلاح کی کوشش ہوتی تو یقیناً عام طور سے جو نقائص محسوس ہوتے ہیں، یہ نہ ہوتے مروجہ نصاب جس کو درس نظامی کہا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ تو چند صدیوں سے اصلاح و ترمیم کے بعد کی ایک مکمل صورت ہے۔ اس ملک کے مختلف ادوار میں کیا کیا نصاب رہا، اسکی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں اور زیادہ تر مقصد۔ اس نصاب کا یہ تھا کہ اس کے پڑھنے سے سارے علوم نقلیہ و عقلیہ میں بحث و نظر اور تحقیق و تدقیق کے اعتبار سے صحیح رسوخ پیدا ہو جائے اور قوی استعداد و قابلیت میسر آئے۔ یہ کبھی مقصد نہیں رہا کہ یہ درس اور یہ نصاب ان علوم کی آخری معلومات اور تفصیلی ابحاث کے لئے بھی کافی ہے، لیکن اس میں شک نہیں اور بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قدیمی نصاب کا واقعی فاضل اور فارغ التحصیل ہر مشکل سے مشکل نظریہ اور جدید مسائل اور جدید علوم کو سمجھنے کی پوری قابلیت و اہلیت رکھتا ہے۔ بطور مثال یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ قدیم بطلیموسی یا فیثاغورسی علم ہیئت سمجھنے والا آج بھی یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ محض مطالعہ سے جدید ہیئت و جدید فلسفہ و سائنس کو سمجھے اور صرف مطالعہ سے ان مشکلات سے عہدہ برا ہو۔ کیا شرح خفری، صدرا، شمس بازغہ اور شرح اشارات سمجھنے والا یہ قابلیت نہیں رکھتا کہ جدید طبیعات و ریاضیات کی جو کتابیں تصنیف ہوئی ہیں انہیں سمجھ سکے؟ یقیناً رکھتا ہے۔

کیا غزالی اور ابن رشد کی تہافۃ الفلاسفہ کو سمجھنے والا ان جدید تالیفات کو نہیں سمجھے گا، یقیناً سمجھے گا اگر قصور ہے تو مطالعہ کا ہے اور نقص ہے تو توجہ نہ کرنے کا بلکہ ان جدید کتابوں کا اسلوب اتنا شگفتہ اور بیان اتنا واضح و دلکش ہوتا ہے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، ہم نے دیکھا کہ جب مصر سے الدروس الاولیۃ فی الفلسفۃ الطبیعیۃ چھپ کر آگئی تو حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری دیوبندیؒ نے اساتذہ دارالعلوم کو پڑھائی تاکہ جدید طبیعات سے ابتدائی واقفیت ان حضرات کو بھی ہو جائے اور ہم نے دیکھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو صرف مطالعہ ہی سے ان جدید علوم ریاضیات وطبیعیات کی اتنی ہی معلومات تھیں جتنی کسی فن کے ماہر و متخصص ہی کو ہو سکتی ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ بعض نظریات یا تحقیقات جو اب تک انگریزی یا جرمنی وغیرہ یورپ کی زبانوں سے عربی میں منتقل نہیں ہوئے ان کا علم بغیر ان زبانوں کے حصول کے نہ ہو سکے۔ لیکن اس میں قصور فن یا استعداد کا نہیں بلکہ زبان کا ہوگا۔

غرض یہ کہ جہاں تک قابلیت و استعداد کا تعلق ہے۔ سابقہ نصاب سے زیادہ معیاری نصاب شاید ہی پیش کیا جا سکے۔ اگر صحیح طریقہ سے سمجھ کر ان علوم کو اور ان سارے فنون کو حاصل کیا جاوے تو ایک غبی ذکی فاضل بن سکتا ہے۔ اور ذکی شخص ایک محقق روزگار بن سکتا ہے، اگر کسی کی تحصیل ہی ناقص ہے، جملہ علوم و فنون حاصل ہی نہ کئے تو نصاب کا کیا قصور!!

سوال تو یہ ہے کہ ان قدیمی علوم و فنون کو اور اس نصاب کو کسی نے باقاعدہ حاصل کیا اور صحیح معنے میں تکمیل کی تو یقیناً جو جامعیت دقت نظر اور رسوخ فی العلم اسے حاصل ہوگا، اسکی نظیر کہیں اور مشکل سے ملے گی۔ بہرحال جو کچھ عرض کیا گیا اس کے صحیح ہونے کے باوجود عربی مدارس کے نصاب تعلیم کی تجدید و ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ اپنے زمانے میں کافی نہ تھا یا صحیح استعداد پیدا کرنے سے قاصر تھا، بلکہ مزید علوم جدیدہ یا معلومات عامہ حاصل کرنے کی ضرورت ہے، وقت کے تقاضے بدل گئے، طبیعتوں کے سانچے بدل گئے اذواق و افکار میں فرق آگیا، عبارتی دقت اور موشگافی کیلئے مزاجوں میں صلاحیت نہیں رہی۔ اب بہت اختصار کے ساتھ ان نقطوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں جن کی وجہ سے یہ تبدیلی یا ترمیم ضروری ہے۔

مدارس دینیہ عربیہ میں اس وقت جو نصاب تعلیم رائج ہے، حدیث و فقہ کی چند کتابوں کو مستثنیٰ کرنے کے بعد زیادہ تر ساتویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے قرون کی یادگار ہے۔ جہاں سے صحیح معنے میں علمی انحطاط کا دور شروع ہو چکا تھا۔ قدماء امت کی وہ تالیفات جن میں علم کی روح موجود

تھی، عبارت سلیس و شگفتہ، مسائل و قواعد واضح، جن میں نہ عبارتی تعقیدات تھیں، نہ دور از کار ابحاث۔ جن کے پڑھنے سے صحیح معنے میں دل و دماغ متاثر ہو سکتے تھے، نہ وقت ضائع ہوتا تھا، نہ دماغ پر بوجھ کا خطرہ ہوتا تھا، ان کی جگہ ایسی کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں سب سے زیادہ کمال اختصار نویسی کو سمجھا گیا، زیادہ زور لفظی بحثوں پر دیا گیا لفظی موشگافیاں شروع ہوئیں، یوں اگر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ کاغذ تو کم خرچ کیا گیا، لیکن وقت و دماغ کو اس کے حل پر زیادہ صرف کیا گیا۔ بڑا کمال یہی سمجھا گیا کہ عبارت ایسی دقیق و غامض ہو جس کے لئے شرح و حاشیہ کی ضرورت ہو، کئی کئی توجیہات کے بغیر حل نہ ہو، آخر یہ علمی عیاشی نہیں تو اور کیا ہے۔ میرے ناقص خیال میں یہ علم کا سب سے بڑا فتنہ تھا جس سے علوم اور اسلامی معارف کو بڑا نقصان پہنچا۔ بطور مثال اسلامی علوم میں اصول فقہ کو لیجئے جو علوم دین اور علوم اجتہاد میں ایک لطیف ترین اور اہم ترین فن ہے، جو قرآن و سنت سے نئے نئے استنباطات کے لئے سب سے اہم راستہ تھا جس کی باقاعدہ تدوین کا فخر دولت عباسیہ کے سب سے پہلے قاضی القضاۃ امام ابو یوسفؒ کو حاصل ہے۔ اور اصول میں ان کے بعد سب سے پہلی کتاب امام محمد ابن ادریس الشافعی کی کتاب الرسالہ ہے جو عرصہ ہوا کہ مصر میں کتاب الام کے ساتھ چھپ چکی تھی اور اب کچھ عرصہ ہوا بہت آب و تاب سے دوبارہ قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔ اسی فن میں امام ابوبکر رازی جصاص (متوفی ۳۷۰ھ) نے کتاب الفصول فی الاصول لکھی جس کا ایک عمدہ نسخہ دار الکتب المصریہ قاہرہ میں موجود ہے، اور جس کی نقل راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی ڈابھیل۔ حال کراچی کے لئے ہندوستان و پاکستان آئی۔ امام فخر الاسلام بزدوی نے کتاب الاصول لکھی جس کی عمدہ ترین شرح عبد العزیز بخاری کی ہے جو ترکی کے سابق دار الخلافہ سے دو دفعہ شائع ہوتی اور جس کی محیر العقول عظیم ترین شرح امیر کاتب عمید الدین اتقانی کی "الشامل" دس جلدوں میں دار الکتب المصریہ قاہرہ میں موجود ہے۔ اور اس کا ایک نسخہ استنبول کے کتب خانہ فیض اللہ آفندی میں ہے لیکن افسوس کہ دونوں جگہ ابتدائی دو ڈھائی جزء کا نقص ہے۔ اس کی نقل بھی راقم الحروف کے توسط سے مجلس علمی میں آ چکی ہے۔ امام شمس الائمہ سرخسی نے کتاب الاصول لکھی جس کے نسخے ترکی و مصر میں موجود ہیں، یہ اور اس کے علاوہ اس فن میں متقدمین کی عمدہ و نافع کتابیں ہیں۔ امام حجۃ الاسلام غزالی کی "   الاصول" اس فن کی عمدہ کتاب ہے اور اس کے علاوہ اس فن میں امام ابو زید دبوسی کی کتاب تقویم الادلہ بے نظیر ہے۔

اب خیال فرمائیے کہ ایسی نادرۂ روزگار کتابوں کی جگہ امام ابن ہمام کی "تحریر الاصول" اور ابن حاجب کی مختصر الاصول اور بیضاوی کی منہاج الاصول یا ابو البرکات نسفی کی منار الاصول یا صدر الشریعہ کی تنقیح الاصول

نے لی۔ اگر تحریر الاصول کی شرح التیسیر والتقریر ابن امیر الحاج کی نہ ہو یا التیسیر ابن امیر بخاری کی نہ ہو اور قاضی بیضاوی منہاج شرح الاسنوی کی نہ ہو تو یہ چیستانین امت کے کیا کام آسکتی ہیں۔ ؟ یہ مانا کہ ان میں کچھ دقیق و لطیف ان کے مختارات یا خصوصی ابحاث بھی ہیں، لیکن دوسری طرف مہمات جس تعبیر میں ادا ہوئی ہیں وہ کوئی علمی روح پیدا کرنے کے لئے مفید نہیں ہو سکتیں۔

اسی طرح صرف ونحو، معانی، بیان، منطق، فلسفہ، فقہ و تفسیر ادب وغیرہ کا اگر جائزہ لیا جاتے تو سب کا حاصل یہی نکلے گا۔ مروجہ درسیات میں ایسی کتابیں داخل ہیں جن میں پوری داد تدقیق دی گئی اور ایجاز و اختصار کا ریکارڈ قائم کیا گیا ہے۔

بیشک ذہن کی جلاء، دقت نظر اور موشگافی کے کمال کو حاصل کرنے کے لئے یہ موزوں ترین ہوں تو ہوں، لیکن عہد حاضر میں ان کے جو نقائص محسوس ہوئے ہیں۔ ان میں سے بطور مثال چند پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ ان کتابوں میں زیادہ تر وقت لفظی مباحث اور عبارتی موشگافیوں پر خرچ ہوتا ہے۔

۲۔ فن کے قواعد اور مسائل کے یاد کرنے کی بجائے مصنف کے مقصد سمجھنے پر وقت ضائع ہوتا ہے۔

۳۔ فن کے قواعد اور مسائل یاد ہو جانے سے جو ایک اعلیٰ سلیقہ اور ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ اور جو ایک خاص قسم کی بصیرت حاصل ہونی چاہئے۔ ان مختصرات سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

۴۔ صرف ان کا پڑھنے اور پڑھانے والا بہت مشکل سے اس فن کا محقق و بالبصیرت عالم بن سکتا ہے۔ مدرس کا سارا وقت اس لفظی اور عبارتی تعقیدات کی نذر ہو جاتا ہے اور اس میں نکتہ آفرینی کو کمال سمجھنے لگتا ہے۔ اس کو اتنی فرصت ہی نہیں مل سکتی کہ اس فن کی امہات اور اساسی تصنیفات کا مطالعہ کر سکے۔

۵۔ مشکل پسندی کا ذوق ختم ہو چکا ہے۔ صرف و نحو کے مسائل میں فقہ و اصول کی عبارات میں، ہیئت و ریاضی کی مثالوں کے قائم کرنے کا دور گزر چکا ہے۔

۶۔ بہت سے دیندار حضرات کو ان علوم اسلامیہ کے حاصل کرنے کا شوق دامنگیر ہوتا ہے۔ لیکن جب ان مشکلات کا احساس ہوتا ہے تو گھبرا کر مجبوراً اپنے ارادہ کو شرمندۂ عمل نہیں کر سکتے

۷۔ جو شخص ذکی الطبع اور ذہین نہ ہو یا محنتی نہ ہو وہ ان کتابوں سے مستفید نہیں ہو سکتا۔

۸۔ متن اور اس پر شرح اور پھر شرح کا حاشیہ یہ اسلوب عصر حاضر کے ذوق کے بالکل خلاف ہے۔

۹۔ ان کتابوں میں اختصار کی وجہ سے فن کے بہت اہم مسائل اور جزئیات نہیں آسکے اور جتنے آسکے اختصار کی وجہ سے اس کے اطراف وجوانب اتنے واضح نہ ہو سکے۔

۱۰۔ علم کلام جدید فلسفۂ جدیدہ، علم الاقتصاد، اور بعض جدید علوم سے قدیم نصاب کا دامن خالی ہے۔

اور آج اسکی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ جس طرح پہلے جہمیہ، حشویہ، خوارج، معتزلہ و قدریہ صحیح مسلک سے ہٹے ہوئے اور باطل فرقے پیدا ہوئے تھے اور جس طرح ان کے عقائد اور ان کی تردید دین کا اہم جز تھا، اسی طرح آج لادینی نظامِ حیات اشتراکیت و سفسطائیت وغیرہ کے مسائل پر قواعدِ اسلام کے پیشِ نظر، نقد و تبصرہ دین کا اہم جزو ہے۔ آج اگر ہمارے اسلاف زندہ ہوتے تو جس طرح اس وقت فرقِ باطلہ کی تحقیق و تنقیح کے لیے امت کے لئے اسلحہ تیار کر کے دے چکے تھے اسی طرح آج بھی جدید اسلحہ دفاع کے لئے تیار کرتے اور علوم کا بیش بہا اضافہ فرماتے۔

اس ضمن میں سرسری طور پر چند موٹی موٹی باتیں عرض کی گئی ہیں۔ اگر ہم ان اشارات کو ذرا اختصار سے پیش کرنا چاہیں تو اس کا خلاصہ دو چیزیں ہیں،

(الف) قدیم علوم کی کتابوں میں اکثر مروجہ کتابوں کی تبدیلی

(ب) جدید علوم کا اضافہ

اگر غور کیا جائے تو ہمارے مدارس میں بیس بائیس علوم کی تقریباً سو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن پر کم از کم آٹھ سال کا عرصہ لگتا ہے۔ ان پر جہاں تک راقم الحروف نے غور کیا بمشکل دس کتابیں ایسی ہیں جن کا ہمیں بدل نہیں ملے گا۔ بقیہ سب کا نعم البدل قدماء ہی کی کتابوں میں مل سکتا ہے۔ ہم ان قدیم علوم کو ہٹانا نہیں چاہتے بلکہ ان علوم میں صحیح مہارت و قابلیت پیدا کرنے کے لئے بہتر کتابوں کو داخل کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی ہم اس سلسلہ میں "تجدد" نہیں بلکہ "تقادم" چاہتے ہیں۔ اور یہ ان علوم اسلامی کی خیر خواہی کے لئے چاہتے ہیں، اور امتِ حاضرہ کے مفاد کے پیشِ نظر یہ خواہش رکھتے ہیں۔

اب میں جن نقطوں کے پیشِ نظر جن خطوط پر جدید نصاب کی بنیاد یا قدیم نصاب کی ترمیم کا خواہش مند ہوں ان کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔

جدید نصابِ تعلیم کی ضرورت اور اسکی خصوصیات | جدید نصابِ تعلیم میں جو بنیادی خطوط ہیں میرے ناقص خیال میں اس کے تین نقطے ہیں۔

(الف) تخفیف:- یعنی نصاب مختصر ہو جس کی فراغت و حصول میں بہت زیادہ عرصہ کی ضرورت نہ ہو۔

(ب) تسہیل:- یعنی نصاب میں مندرجہ کتابیں سہل و سلیس زبان میں ہوں، پیچیدہ و دقیق نہ ہوں۔

(ج) محو و اثبات یا اصلاح و ترمیم:- یعنی بعض غیر اہم فنون کو ساقط کر کے جدید مفید علوم کا اضافہ۔

پہلے نقطے کی تشریح | نصاب جتنا مختصر ہوگا اس کے طالبین وشائقین میں حصول کا جذبہ زیادہ پیدا ہوگا۔ یہ درست ہے کہ مختصر نصاب سے بعض اوقات ہر طبیعت پوری طرح مستفید نہ ہوسکے گی۔ لیکن اسکی تلافی کے لئے ایک مشترکہ عام نصاب کے بعد تخصص وتکمیل (ڈاکٹریٹ) کے درجات مقرر کئے جائیں، جس کو جس فن سے زیادہ مناسبت ہو یا طبعی رجحان ہو اسکو وہ حاصل کر کے فن کا ماہر خصوصی بن سکے گا۔ مصر کے جامع ازہر نے جدید نظام تعلیم میں انہی اصولوں کا خیال کیا ہے۔ اور جامع ازہر کے جدید نظام تعلیم میں تین کلیات (کالج) ہیں۔ (۱) کلیۃ اصول الدین۔ (۲) کلیۃ الشریعۃ۔ (۳) کلیۃ الآداب۔ پھر ہر کلیہ میں کچھ درجات تخصص (ڈاکٹریٹ) کے رکھے ہیں۔

میرے خیال میں تخصص وتکمیل کے لئے حسب ذیل درجات ہونے چاہئیں۔

(۱) التخصص فی علوم القرآن والتفسیر (۲) التخصص فی علوم الحدیث۔ (۳) التخصص فی الادب والتاریخ۔ (۴) التخصص فی الفقہ واصول الفقہ والقضاء والافتاء۔ (۵) التخصص فی علم التوحید والفلسفہ والمعقول (۶) التخصص فی علم المعیشۃ والاقتصاد (۷) التخصص فی علم الاخلاق والتصوف۔

سہ سالہ مختصر نصاب | اس ضمن میں میری ایک خواہش یہ ہے کہ ہمارے مرکزی مدارس میں جہاں علمی نصاب وعلمی تحقیقات کے لئے کوشش ہو اس کے ساتھ ایک ایسا مختصر نصاب ان حضرات کے لئے مقرر کیا جائے جو انگریزی تعلیم سے بقدر ضرورت فراغت پا چکے ہیں۔ وہ مدرس عالم بننا نہیں چاہتے بلکہ صرف اپنی دینی ضرورت کے پیش نظر قرآن وحدیث واسلامی علوم سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ ایک سہ سالہ نصاب مقرر کیا جائے، جس میں صرف ونحو، قرآن، حدیث، فقہ وعقائد اور ادب وتاریخ تک علوم شامل ہوں ان کو پڑھ کر عربی زبان میں بولنے اور لکھنے کی قدرت کے ساتھ اپنی ضرورت کو پورا کر سکے اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وقت کے اہم تقاضوں میں سے ایک تقاضہ یہ بھی ہے اور بہت سے قلوب میں یہ تڑپ موجود ہے۔

جہاں اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ ایک انگریزی گریجوایٹ عالم دین بن سکے۔ اس کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہوگا کہ دینی ودنیوی تعلیم میں جو خلیج حائل ہے اور فریقین ایک دوسرے سے مسلک وخیال میں دو نقطوں پہ الگ الگ ہیں۔ ان میں اجتماع کی خوشگوار صورت پیدا ہوگی۔ اور ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں گے۔ اور خیالی ووہمی بدگمانیوں میں جو ہر فریق مبتلا ہے۔ یہ اختلاف بھی ختم ہو جائے گا۔ اسلئے اب ہمیں تین نصابوں کی ضرورت ہوگی۔ (۱) ایک مدرس عالم کے لئے نصاب۔ (۲) دوسرا ماہر خصوصی

کے لئے نصاب۔ (۳) تیسرا صرف دینی ضرورت کے لئے عالم بننے کا نصاب۔

دوسرے نقطے کی تشریح | دوسرا نقطہ تیسیر کا تھا۔ اس کے متعلق گذارش یہ ہے کہ ہر زمانے کا ایک خاص مزاج اور خاص ذوق ہوتا ہے۔ جب علم کی صحیح ترقی ختم ہوگئی یا رک گئی یا یوں کہئے کہ معراجِ کمال تک ان علوم اسلامیہ اور مبادی علوم کا معیار جب بلند ہوا تو طبعی طور پر انحطاط لازمی تھا، اب سارا زور و کمال تالیف کا معیار قواعد کی تلخیص، مسائل کی تنقیح عبارت آرائی، متن نویسی و ایجاز طرازی اختصار کے نئے نئے اسلوب، لفظی موشگافی وغیرہ قرار پایا۔ علمی مسابقت کا میدان بھی بن گیا۔ منظوم قواعد تیار ہونے لگے۔ مبادی و وسائل مقاصد بن گئے۔ علوم عربیت کا مقصد قرآن و حدیث کے لغوی ترکیبی اور اعرابی مشکلات کا حل تھا۔ لیکن آگے چل کر یہ مبادی خود مقاصد بن گئے قرآن و حدیث کی تراکیب اپنی جگہ رہیں خود ان کتابوں کے مسائل و عبارات مرکز توجہ بن گئے۔ ابن حاجب کے کافیہ کو لیجئے جس کی پچاس سے زیادہ شرحیں لکھی گئیں، پھر شرح ملا جامی جو ان مشروح میں سے ایک شرح ہے۔ اس کے حواشی اور شروح کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ اس پر اسکی شرح عبدالغفور کو لیجئے، پھر اس کا تکملہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور ان دونوں کی شرح "دافع التوہمات" کو دیکھئے، اسی طرح ابن مالک کی "الفیہ" اس کی شروح اور ان میں سے شرح "اشمونی" اور پھر اس کی شرح "صبان" سات ضخیم مجلدات میں دیکھئے کہ ساری عمر انہی کے مطالعہ کی نذر ہو جائے۔ آخر غور کیا جائے کیا یہ مبادی واقعی اتنی توجہ کے مستحق تھے! بہرحال جو کچھ ہوا ایک خاص دور کا تقاضا تھا اور ذوق طلب تھا۔ جو پورا ہوگیا۔ اس طرح بقیہ علوم و بقیہ کتب کی حالت کو قیاس کر لیجئے۔ اب نہ تو طبائع میں وہ جولانی رہی اور نہ وہ جفاکشی، محنت و عرق ریزی کی صلاحیت دماغوں میں رہی، نہ وہ فرصت و طمانیت رہی اور سب سے بڑی بات یہ کہ نہ اسکی حاجت رہی مشکل پسندی سے فکر اکتانے لگی، جدید کتابیں لکھی گئیں، ادب و انشاء کا طرز و اسلوب بدل گیا، قدما کی کتابیں پریس میں آنے لگیں اہل عصر نے ہمت کر کے ذوق عصری کی تشنگی کے لئے جدید سانچوں میں عنایت طبع کی خاطر عمدہ تصنیفات پیش کیں۔ اس ماحول میں اگر ہم اب بھی ان غیر اہم وسائل پر جمے رہیں گے تو علوم اسلامیہ سے توجہات ہٹ جائیں گی اور ہمارا یہ طرز عمل ہمارے اکابر و سلف کی اس "تراثِ فاخر" اور اس علمی ثروت و سرمایہ کو فنا کے گھاٹ اتار دیگا۔ یہ درحقیقت علم کی خیر خواہی نہیں۔ بلکہ نادان دوست کا سا طرز عمل ہوگا، کیا فقہ اسلامی میں کنز الدقائق، وقایہ، نقایہ اور شرح وقایہ کے بہترین بدل اسلاف ہی کی کتابوں میں موجود نہیں، کیا جامع صغیر، جامع کبیر وغیرہ براہ راست مدون فقہ امام محمد بن الحسن الشیبانی کی کتابیں ہر حیثیت سے جامع نہیں ہیں؟ ان میں

جو علم اور برکت ہوگی وہ ان متاخرین کی کتابوں میں کہاں سے ملے گی۔ میرے ناقص خیال میں کتب نقہ میں نور الایضاح، قدوری اور ہدایہ کے علاوہ بقیہ سب قابلِ تبدیلی ہیں۔

دیکھئے فلسفہ، منطق اور کلام کو لیجئے، امام حجۃ الاسلام غزالی کے چند رسائل محک النظر، معیار العلم مقاصد الفلاسفہ الاقتصاد فی الاعتقاد، وغیرہ وغیرہ کے پڑھنے سے وہ مہارت پیدا ہو سکتی جو مشکل ان بڑی دقیق وطویل کتابوں سے حاصل ہوگی، غزالی کی حسنِ تعبیر، تفہیم اور حل مشکلات کی فوق العادۃ قدرت کا کیا دنیا کے مسلّمات میں شمار نہیں۔؟ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض مسائل فن کے غیر مذکور ہوں اور بعض غیر منقح ہوں، لیکن جتنے مذکور ہیں ان سے جتنی مہارت ومناسبت انشراح صدر واطمینان قلب حاصل ہو سکتا ہے، متاخرین کی اکثر کتابوں میں وہ روح کبھی نہیں مل سکتی۔ امام رازی، جو منطق وفلسفہ کے سب سے بڑے امام ہیں ان کی کتابیں نہایت سلیس شگفتہ عبارت میں امت کی جو رہنمائی وعقدہ کشائی کر سکتی ہیں وہ متاخرین کی کتابیں کبھی نہیں کر سکتیں۔ امام رازی کے لباب الاشارات، المحصل والاربعین کو دیکھئے۔ مصنّف کو دل سے دعا دیجئے۔ کیا مشکلات کو مشکل تر بنانا یہ کمال ہے، یا مشکلات کو آسان بنا کر امت کے سامنے پیش کرنا کمال ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ناظرین کی خدمت میں پیش کی گئی ہیں۔ بہرحال تیسیر کو اختیار کرنا نہ صرف وقت کا اہم تقاضا اور امت حاضرہ کی اہم ضرورت ہے بلکہ علوم اسلامیہ کی صحیح خدمت ہے۔ اور علوم سے پہلے دینِ اسلام کی خدمت ہے۔

فرض کیجئے کہ ہم نے کاغذ بچا کر ایک صفحہ میں اتنے اختصار کے ساتھ کسی مضمون کو ادا کیا جسکی تفصیل چند ورق میں ہو سکتی ہے، لیکن اس کے پڑھانے کے لئے مدرس کو ایک گھنٹہ کا وقت دینا پڑا اور کافی تمہید وتشریح کے بعد وہ بمشکل حل ہوا، لیکن یہاں تشریح دماغ سے غائب ہوئی مضمون بدستور چیستاں رہا۔ اگر اس کے بجائے وہ مضمون دو صفحات میں ادا کیا جاتا اور سرسری نظر میں ذہن نشین ہو جاتا تو بتائیے کون سا طریقہ بہتر ہوتا۔؟ غور فرمائیں بلاشبہ کاغذ دوشنائی تو زیادہ خرچ ہوئی، لیکن وقت اور دماغ کم خرچ ہوا، گویا ہم نے اختصارات وایجازات سے کاغذ پر تو رحم کیا لیکن دماغ جیسے لطیف جوہر اور وقت جیسے گرانمایہ سرمایہ کو بے رحمی سے خرچ کیا۔ کیا غزالی ورازی، تقی الدین ابن دقیق العید، عزالدین ابن عبدالسلام، ابن تیمیہ، ابن القیم جیسے افراد روزگار محققین ان چیستانوں کی بدولت اذکیاء امت میں شمار ہوئے ہیں۔ کیا ان بزرگوں کی کتابوں میں ان متاخرین یا قرونِ وسطیٰ کے مشکل پسند طرزِ تعبیر کا کہیں پتہ ملتا ہے۔؟ ــــ داستان طویل اور دردناک ہے، حاصل وہی ہے جو گذشتہ سطور میں پیش کیا گیا۔

(باقی آئندہ)